محمد معروف

مسئلہ جبر و قدر اور قرآن

مسئلۂ جبر و قدر ہمیشہ سے نہ صرف اختلافی اور مابہ النزاع مسئلہ رہا ہے، بلکہ اسی لیے میں فکری اختلاف نے متعدد مکاتب فکر پیدا کیے۔ اس موضوع پر دوسرے اہل علم کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر پر کئی آیات ملتی ہیں۔ جن میں بعض صریحاً جبریہ ہیں اور بعض صریحاً قدریہ۔

سورۃ الدھر میں ۲۹۔ ۳۰ ویں آیات

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

پس جو کوئی چاہے اپنے پروردگار کی راہ پکڑے۔ لیکن تم نہیں چاہتے مگر اللہ چاہتا ہے۔ تحقیق اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

سورۃ ابراہیم میں چوتھی آیت

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

پس اللہ جس کو چاہے گمراہ کرتا ہے۔ اور جس کو چاہے راہ دکھاتا ہے۔ اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

اور سورۃ ہود میں ۳۴ ویں آیت

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ

اگر اللہ تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اگر میں تمہیں نصیحت کرنے کا ارادہ بھی کروں تو میری نصیحت تمہیں کوئی

فائدہ نہ دے گی۔

یہ تمام جبریہ مفہوم کی آیات ہیں۔ جن میں انسان کو خدا کے ارادے کے آگے بے بس و مجبور بتایا گیا ہے۔

ان کے برعکس سورۃ الدھر کی دوسری اور تیسری آیات

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝

پس ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا کیا۔ تحقیق ہم نے اس کو راہ دکھلائی۔ یا وہ شکر کرنے والا ہوتا ہے یا کفر کرنے والا۔

سورۃ الکہف ۲۹ ویں آیت

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ

اور کہہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے پس جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے کفر کرے۔

اور سورۃ حٰمٓ السجدہ ۴۶ ویں آیت

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

جو کوئی اچھا کام کرے اپنی جان کے واسطے اور جو کوئی بُرا کام کرے اس کے اوپر ہے۔ اور تیرا پروردگار بندوں کے واسطے ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

ان تمام آیات میں انسان کو اپنے اعمال پر حاوی اور ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ گویا قرآن مجید میں اس مسئلہ پر دو متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ اسی قسم کے تضادات کی بنا پر غیر مسلم اور خصوصاً عیسائی ناقدین نے قرآن مجید کو کتاب آسمانی ماننے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ دنیائے اسلام میں جب سے آزاد فکر یعنی علم کلام وجود میں آیا ہے۔ مسلم مفکرین ان تضادات کو دور کرنے کی فکر میں ہیں۔ ویسے بھی عقل انسانی تضاد کی دشمن ہے۔ اور جہاں کہیں اسے فکر میں تضاد ملے اسے دور کرنے میں کوشاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان تضادات کو دور کرنے کی کئی کامیاب و ناکام کوششیں کی جا چکی ہیں۔ اس مضمون میں چونکہ میرا تعلق صرف مسئلہ جبر و قدر کے

تضاد سے ہے۔ لہذا میں چند ان قابل ذکر کوششوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس تضاد کو دور کرنے کے لیے کی جا چکی ہیں۔

ہر تضاد کو دور کرنے کے لیے عام طور پر تین طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں :

۱۔ تضاد کی ایک ضد کو تسلیم کر کے دوسری ضد کو یا تو نظر انداز کر دیا جائے یا اس کو غیر حقیقی قرار دے دیا جائے۔

۲۔ ضدین کے مابین مصالحت کرا دی جائے۔

۳۔ ضدین کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن ان کے باہمی تضاد سے انکار کر دیا جائے۔

یہی تین طریقے قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر سے متعلق آیات کے تضاد کو دور کرنے کے لیے استعمال میں لائے گئے ہیں۔

۱۔ بعض مفکرین نے تمام ان آیات قرآنی کو صحیح تسلیم کیا جو قدر کی حامل تھیں۔ اور جبریہ آیات کو یا سرے ہی سے نظر انداز کر دیا، یا پھر ان کے مفہوم کو توڑ موڑ کر قدریہ بنانے کی کوشش کی۔ مثلاً معتزلہ نے سورۃ ابراہیم کی آیت : فیضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء کا ترجمہ یوں کیا کہ " اللہ جو کوئی چاہے اس کو گمراہ کرتا ہے۔ اور جو کوئی چاہے اس کو راہ دکھاتا ہے"۔ یہ لوگ قدریہ کہلائے۔ اس کے برعکس بعض لوگوں نے صرف جبریہ آیات کو تسلیم کیا۔ اور قدر آیات کو نظر انداز کر دیا۔ یہ لوگ جبریہ کہلائے۔

۲۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنھوں نے دونوں قسم کی آیات کو قبول کیا۔ اور ان میں تضاد کو بھی تسلیم کیا۔ لیکن زبان کے ہیر پھیر سے تضاد کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ پس ابو ہذیل العلاف کہتا ہے " جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے۔ انسان کو اپنے اعمال پر پوری قدرت حاصل ہے لیکن حیات بعد الممات میں ہر شئے مجبور ہو گی"۔ النظام کے الفاظ میں " انسان ایک خاص حد تک قادر ہے۔ اس کے بعد مجبور۔ وہ ایک پتھر آسمان کی طرف پھینک سکتا ہے۔ لیکن ایک خاص اونچائی تک جانے کے بعد پتھر زمین کی طرف گرنا شروع ہو جائے گا۔ یہ قدرت کے اختتام اور مجبوری کی

ابتدا کی حد ہے۔"

۳۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے قرآنی آیات کو جوں کا توں مانا۔ لیکن ان میں کسی قسم کا تضاد ماننے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ خدا کی حکمت میں تضاد ہو ہی نہیں سکتا اور یہ جو تضاد ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ در اصل ہماری محدود عقل کا وہم و گمان ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ یہ عام مسلمانوں کا نظریہ ہے۔ جو قرآن مجید کی کسی بھی آیت کے متعلق میں میخ نکالنے کے روادار نہیں۔

لیکن ان تمام کوششوں سے جو اب تک کی جا چکی ہیں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ طے کیے بغیر ہی کہ آیا ان آیات میں کوئی تضاد موجود بھی ہے یا نہیں۔ اس تضاد کو فرض کر لیا۔ اور اسے رفع کرنے کے درپے ہو گئے۔ حالانکہ اس سے قبل کہ وہ ان ناکام کوششوں میں اپنا وقت ضائع کرتے انھیں یہ معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ آیا قرآن مجید کی جبریہ اور قدریہ مفہوم کی آیات میں تضاد ہے بھی یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں کیا جبر اور قدر متضاد ہیں؟

مندرجہ بالا سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں ہر دو الفاظ جبر اور قدر کا صحیح مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔ پہلے لفظ جبر کو لیجیے۔ یہ ایک مبہم لفظ ہے جس سے مراد یا تو مشروطیت (Determination) ہے یا مجبوری (Compulsion)۔ اول الذکر معنی میں ہر فعل و واقعہ مجبور ہے۔ کیونکہ جب بھی کوئی واقعہ یا فعل رونما ہوتا ہے تو بعض ضروری شرائط کی موجودگی میں رونما ہوتا ہے۔ ان ضروری شرائط کو عام طور پر چار قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ا۔ عمومی شرائط (Nomic Conditions) مثلاً قوانین قدرت اور قوانین نفسیات۔

ب۔ وارداتی شرائط (Occurrent Conditions) جو تمام ان واقعات و واردات پر جو عامل کے اندر اور باہر رونما ہو رہے ہوتے ہیں، مشتمل ہیں۔

ج۔ رجحانی شرائط (Dispositional Conditions) جو عامل کے رجحانات اور دوسرے عوامل کے رجحانات پر مشتمل ہیں، اور

د۔ پس منظری شرائط (Background Conditions) جن میں پس منظر کے تمام واقعات شامل ہیں۔

مندرجہ بالا چاروں قسم کی شرائط کسی فعل یا واقعہ کے لیے ضروری اور کافی ہیں۔ یعنی ان کی موجودگی میں کوئی فعل یا واقعہ رونما ہوتا ہے اور ان میں سے کسی بھی ایک کی عدم موجودگی میں وہ فعل یا واقعہ رونما نہیں ہوتا۔ ان تمام شرائط کا پورا ہونا ان افعال و واقعات کے لیے بھی جو عام طور پر آزادگردانے جاتے ہیں اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ان کے لیے جو مجبور ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ شرائط آزاد و مجبور ہر دو قسم کے افعال و واقعات کے لیے یکساں اہم ہیں۔ پس مشروطیت کے معنے میں جبر قدر کا متضاد نہیں۔ بعض اوقات قدر سے مراد غیر مشروطیت لی جاتی ہے۔ لیکن عربی زبان میں لفظ قدر کے معنی اندازہ لگانے یا مقرر کرنے کے ہیں۔ اور اندازہ لگانے یا مقرر کرنے کا دار و مدار ضروری شرائط پر ہے۔ لہذا قدر سے مراد غیر مشروطیت نہیں بلکہ مشروطیت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس پر اس کا دار و مدار ہے۔

ہماری روزمرہ گفتگو میں جبر مؤخر الذکر معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور انھی معنی میں یہ عام طور پر لفظ قدر کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں شخص مجبور ہے یا اس نے مجبوری کے تحت فلاں کام کیا ہے تو ہم اسے عام طور پر اپنے افعال و حرکات کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص جنگل بیابان میں ڈاکوؤں کے نرغے میں آجاتا ہے جہاں سے وہ نہ تو بھاگ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو مدد کے لیے پکار سکتا ہے۔ تو ہم اس شخص کو اور اس کی حرکات و سکنات کو مجبور قرار دیتے ہیں۔ بلکہ ہمیں اس کی بے بسی پر رحم آتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص جان کے ڈر سے کسی اہم دستاویز پر دستخط کرتا ہے تو اس کا یہ فعل عام طور پر آزاد نہیں مانا جاتا۔ اور ہم اس شخص کو

مجبور سمجھتے ہیں۔ یہ تمام بیرونی مجبوری کی مثالیں تھیں۔ لیکن مجبوری محض بیرونی ہی نہیں بلکہ اندرونی بھی ہوتی ہے۔ ایک شخص جو Washing Mania کا شکار ہے وہ مجبور ہے کہ ہر وقت ہاتھ دھوتا رہے۔ اسی طرح جو شخص Kleptomania کا مریض ہے وہ مجبوراً چوری کرتا ہے۔ اور وہ اپنے افعال میں یقیناً آزاد نہیں بلکہ مجبور ہے۔ اس کے برعکس جب ہم کوئی فعل بغیر کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی مجبوری کے کرتے ہیں۔ ہم اس میں آزاد ہیں اور اس کے ذمہ دار ہیں۔ مثلاً ہمارا صبح سویرے اٹھنا۔ منہ ہاتھ دھونا۔ ناشتہ کرنا۔ اور کالج آنا عام حالات میں آزاد افعال ہیں۔ کیونکہ یہ کسی اندرونی یا بیرونی مجبوری کے تحت سرانجام نہیں دیے جاتے۔ پس مجبوری کے معنی میں لفظ جبر قدر کا متضاد ہے۔

اب تک ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جبر مجبوری کے معنی میں قدر کی ضد ہے۔ مشروطیت کے معنی میں اس کی ضد نہیں۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جبریہ آیات میں جبر کا مفہوم کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید میں ہر فعل اور واقعہ کو مشروط قرار دیا گیا ہے یا مجبور؟ اگر ہم جبریہ مفہوم کی آیات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا، ان میں عموماً خدا کے ارادے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہر فعل اور واقعہ کا جو دنیا میں رونما ہوتا ہے، دارومدار خدا کے اس ارادے پر ہے۔ مثلاً سورۃ ہود میں ۳۴ ویں آیت ہی کو لیجیے۔ وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِيٓ إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ (اگر اللہ تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو میں تمہیں نصیحت کرنے کا ارادہ بھی کروں تو میری نصیحت تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گی)۔ اس آیت میں لفظ يُرِيدُ آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "ارادہ کرتا ہے" اور اشارہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کی طرف ہے۔ دوسری ایسی آیات میں بھی یا تو ارادہ کا لفظ آتا ہے یا پھر لفظ يَشَآءُ مستعمل ہے جس کے معنی ہیں "چاہنا" یا "ارادہ کرنا"۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'ارادہ' سے کیا مراد ہے؟

جب ہم کسی فعل کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو ہم وہ تمام ضروری شرائط پوری کرتے ہیں جن

کی موجودگی میں مطلوبہ فعل خود بخود رونما ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ایک سائنسدان اپنی تجربہ گاہ میں پانی بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ تمام ضروری شرائط پوری کرتا ہے جن کی موجودگی میں پانی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کو اپنی تجربہ گاہ میں ایک خاص مقدار میں مخصوص حالات میں اکٹھا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر میں میز پر سے قلم اٹھانے کا ارادہ کرتا ہوں تو مجھے اپنے بازوؤں۔ ہاتھوں اور انگلیوں کو خاص قسم کی حرکات دینی پڑیں گی۔ یہ حرکات میرے ارادہ کی اہم شرائط ہیں۔ اگر میں ان اعضاء کو حرکت نہیں دوں گا تو میں قلم نہیں اٹھا سکوں گا۔ یہ یہ شرائط محض تکمیل ارادہ کے لیے ضروری نہیں۔ بلکہ ہمارے ارادے کا اہم جزو ہیں۔ اور ان کے بغیر ارادہ ارادہ نہیں ہوگا بلکہ محض ایک خواہش ہوگی۔ مثلاً اگر میں میز پر سے قلم اٹھانے کی خواہش کروں لیکن مطلوبہ حرکات نہ کروں تو یہ محض خواہش ہی ہوگی۔ ارادہ نہیں ہوگا۔ مشہور جرمن فلسفی کانٹ (Kant) کے الفاظ میں ارادہ کسی فعل یا واقعہ کو پیدا کرنے کے مقصد کے لیے تمام ضروری ذرائع کو استعمال کرنے کا نام ہے۔ پس کسی فعل یا واقعہ کو وجود میں لانے کے لیے تمام ضروری شرائط یا ذرائع ارادہ کا ایک اہم جزو ہیں۔ ارادہ کم از کم دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ خواہش اور ضروری شرائط یا ذرائع۔

بعینہٖ جب خدا کسی واقعہ یا فعل کا ارادہ کرتا ہے تو تمام وہ شرائط پیدا کر دیتا ہے جن کی موجودگی میں وہ فعل یا واقعہ خود بخود رونما ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ کسی علاقے میں بارش برسانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ پہلے پانی سے بھاپ، پھر بھاپ سے بادل بناتا ہے۔ اور پھر بادلوں سے مینہ برساتا ہے۔ یا جب وہ کسی جگہ پر زلزلہ لانے کا ارادہ کرتا ہے تو زمین کی سطح کے نیچے، اور اوپر وہ تمام حالات پیدا کر دیتا ہے جن کی موجودگی میں زلزلہ آجاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے اور خدا کے ارادے میں کوئی فرق نہیں۔ ہمیں تکمیل ارادہ کے لیے دوسروں کے ارادوں اور گرد و پیش کے حالات کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جو ہمارے ارادے کا جزو نہیں۔ بلکہ بعض اوقات ہمارے ارادے کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی منزلِ مقصود

تک پہنچنے کے لیے پہلے راہ کی ان رکاوٹوں کو دور کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے کوشش درکار ہوتی ہے جو ہمارے ارادے کا ایک اہم جزو ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے بس میں سوار ہوتے ہیں تو ہم بس ڈرائیور کے ارادے اور بس کی حرکات کے محتاج ہوتے ہیں۔ جو یقیناً ہمارے ارادے کا جزو نہیں ہیں۔ اور اگر بس ڈرائیور بس چلانے سے یا بس کسی خرابی کے باعث چلنے سے انکار کر دے تو ہمارے ارادے کی تکمیل نہ ہوگی۔ یہ محض خواہش ہی ہوگی۔ ارادہ نہیں ہوگا۔ پس وہ تمام شرائط جو ہمارے تکمیل ارادہ کے لیے ضروری ہیں، ہمارے ارادے کا جزو نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے بیشتر ہمارے ارادے سے باہر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی ارادے کو محدود و محتاج (Finite) کہا جاتا ہے۔ اور انسان کو بھی محدود و محتاج ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس خدا قادر مطلق ہے، لہذا اس کا ارادہ بھی مطلق و لامحدود (Infinite) ہے۔ اسے تکمیل ارادہ کے لیے نہ تو کسی ایسی شے کا محتاج ہونا پڑتا ہے جو اس کے ارادہ سے باہر ہو اور نہ ہی کسی قسم کی کوشش درکار ہوتی ہے۔ چونکہ وہ ہر شئے پر حاوی ہے اس لیے ہر ضروری شرط جو اس کے تکمیل ارادہ کے لیے درکار ہے اس کے ارادے کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا ارادہ کرتا ہے اور وہ پورا ہو جاتا ہے۔ پس قرآن مجید میں آتا ہے: انما قولنا لشی اذا اردناه ان نقول له کن فیکون ۝ (جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو بس اسے کہہ دیتے ہیں کہ 'ہو جا' اور وہ ہو جاتی ہے)۔

پس ارادے کے اس تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارادے کا تعلق مشروطیت سے ہے مجبوری سے نہیں۔ بالفاظ دیگر جب خدا کسی فعل یا واقعہ کا ارادہ کرتا ہے تو اسے مشروط کرتا ہے مجبور نہیں کرتا۔ اور چونکہ قرآن مجید میں جبریہ مفہوم آیات میں عموماً ہر فعل اور واقعہ کا انحصار خدا کے ارادے پر بتایا گیا ہے لہذا ان آیات میں جبر کا مفہوم مشروطیت ہے مجبوری نہیں۔ اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جبر مشروطیت کے معنی میں قدر کا متضاد نہیں۔ لہذا قرآن مجید کی جبریہ اور قدریہ آیات میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔